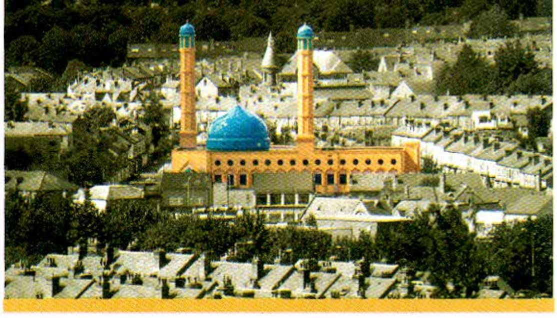

اسلام اور مغرب

چند اہم مباحث

ڈاکٹر ممتاز احمد ہیمپٹن یونیورسٹی ہیمپٹن، ورجینیا، امریکا میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کی اسلامی تحریکیں ان کی تحقیق کا خصوصی موضوع ہیں۔

''اسلام اور مغرب'' ایک ایسا موضوع ہے، جو آج کل شرق وغرب میں ہر جگہ زیر بحث ہے۔ آئے دن نئی کتاب سامنے آرہی ہے، مضمون پڑھے اور لکھے جارہے ہیں، مکالمہ ہو رہا ہے، کانفرنسیں اور سیمینارز منعقد کیے جارہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عالمی سیاست اور فکری دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ اب یہی رہ گیا ہے۔ مجھے اس موضوع کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن مغرب کے بعض علمی اور سیاسی حلقوں کی اس موضوع پر مبالغہ آمیز توجہ، جس مفروضے پر مبنی ہے، وہ یہ ہے کہ اس قضیہ میں اصل مرکزیت مغرب کو حاصل ہے اور یہ کہ مستقبل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے امکانات کا دارومدار اب اس پر ہوگا کہ وہ مغرب سے اپنے تعلقات کس نہج پر استوار کرتے ہیں۔ گویا مغرب ہی وہ واحد تہذیبی اور اخلاقی پیمانہ ہے، جس سے اسلام اور باقی تمام غیر مغربی تہذیبوں کو ناپا اور تولا جائے گا۔ یہ مقدمہ میرے نزدیک محل نظر ہے۔

''اسلام اور مغرب'' کے تعلقات پر جاری اس بحث کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم دونوں اصطلاحوں کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کریں، یعنی یہ کہ جب ہم ''مغرب'' یا ''اسلام'' کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔

پہلے ہم ''مغرب'' کو لیتے ہیں۔ یہ سوال بہت اہم ہے کہ کیا مغرب ایک تہذیبی اکائی ہے یا جغرافیائی؟ انیسویں صدی کے نصف میں ایک امریکی مصنف نے لندن کے کسی اخبار میں ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا ''ویسٹرن کلچر''۔ وہ اس عنوان کو دیکھ کر ہنس پڑا اور جب اس کیفیت سے نکلا تو اس نے اخبار کے ایڈیٹر کے نام خط میں سوال کیا کہ یہ ''ویسٹرن کلچر'' کس چڑیا کا نام ہے؟ تم یورپ والوں کا کلچر الگ ہے، ہم امریکنوں کا کلچر الگ ہے، اور یہ کہ آئندہ اپنی چالاکیوں میں ہم معصوم اور بھولے بھالے امریکنوں کو شامل کرکے بدنام کرنے کی کوشش نہ کرو۔ مارک ٹوین جب انیسویں صدی کے نصف آخر میں ''کورٹ آف سینٹ جیمز'' میں گیا اور اس سے ''ویسٹ'' کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ ''امریکن ویسٹ'' کی باتیں کرنے لگا۔

''مغرب'' کا لفظ ''اسلام اور مغرب'' کی بحث میں ہمارے ہاں جس بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ استعمال کیا جارہا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''مغرب'' کسی بہت متعین اور واضح اکائی کا نام ہے اور اس کے تشخص میں کسی ابہام کا امکان نہیں ہے۔ میرے خیال میں معاملے کی حقیقی نوعیت یہ نہیں ہے۔ ''مغرب'' کا تصور ایک مبہم تصور ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی متفقہ تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور مذہبی حدود کا تعین کرنا مشکل ہے۔ بحیثیت ایک جغرافیائی تہذیبی اکائی، انیسویں صدی تک ''مغرب'' کا کوئی واضح تصور ہمیں (مغربی) لٹریچر میں نظر نہیں آتا۔ مغرب کا ایک مبہم سا تصور اس وقت ابھرنا شروع ہوتا ہے، جب نظام سرمایہ داری کے استحکام، قومی بنیادوں پر ریاستوں کے قیام اور یورپین ملکوں کی نوآبادیاتی یلغار کے بعد، ان ملکوں کا واسطہ ''مشرق'' سے پڑتا ہے۔ یوں ایک پہلو سے دیکھا جائے تو ''مغرب'' نے اپنے الگ تہذیبی اور سیاسی تشخص کا شعور ''مشرق'' کے ساتھ اپنے روابط اور تصادم سے حاصل کیا ہے۔ یہ چیز صرف مغرب تک ہی محدود نہیں ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر شناخت کا موضوعی شعور (Subjective consciousness) بالعموم فریق دیگر (OTHER) سے تصادم کے نتیجے ہی میں پیدا ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک دلچسپ تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ یورپی نشاۃ ثانیہ (European Enlightenment) کی رجائیت پسند اور مسلسل ترقی کے امکانات پر مبنی فکری اور سیاسی پیش رفت کے دور میں بہت کم مغربی مفکرین ''مغربی تہذیب'' کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔ ''مغربی تہذیب کی انفرادیت'' اخلاقی برتری اور اس کی عالمگیر حیثیت (Universal Relevance) کا زیادہ چرچا اس کے دور عروج میں نہیں بلکہ اس کے دور انحطاط میں ہوتا ہے۔ یہ دور جنگ عظیم اول سے شروع ہوتا ہے، جب مغرب کی رجائی فکر کو پہلا بڑا دھچکا لگتا ہے۔ اسی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے بڑے بڑے مفکرین، جن میں آسولڈ اسپنگلر، سوروکن اور ٹائن بی شامل ہیں، بیک وقت مغرب کی اخلاقی اور تہذیبی برتری کے ایک دیو مالائی ماضی (Mythical past) کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ہم عصر دور میں اس کے تہذیبی واخلاقی اور سیاسی زوال کا رونا روتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یہی وہ دور ہے، جب مشرقی تہذیبوں کے مقابلہ میں مغرب کی فکری برتری کی سب سے بڑی پہچان، یعنی عقلیت پسندی کے خلاف

ایک طرف نطشے اور دوسری طرف سگمنڈ فرائیڈ بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں اور جرمن سوشیالوجسٹ میکس ویبر عقل مطلق پر مبنی مغربی معاشرے کو آہنی پنجرے (Iron case) سے تعبیر کرتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اہل مغرب میں ''مغرب'' کے تہذیبی تشخص کا اظہار اس کے نقطۂ عروج سے نہیں، نقطۂ زوال سے شروع ہوتا ہے اور یہ تشخص، بڑی حد تک، نوآبادیاتی نظام کے خلاف ''مشرق'' کی مزاحمت کے جواب میں ایک دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ آج بھی صورت اس سے مختلف نہیں ہے۔ سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیر اور امریکی صدر جارج بش نے کئی بار ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ عراقی مزاحمت کے خلاف ان کی جنگ ''تہذیب مغرب'' کو بچانے کی جنگ ہے۔ یہاں بھی تہذیبی تشخص ایک دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال ہو رہا ہے اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ گویا یہ دو تہذیبوں کی جنگ ہے۔

مغرب کا ایک اور تصور جغرافیائی وحدت کا بھی ہے، لیکن یہ تصور شاید اس دور میں زیادہ صحیح تھا جب مغرب سے مراد صرف یورپ اور وہ بھی مغربی یورپ تھا۔ مغرب کے جغرافیائی تصور کی ابتداء ایک لحاظ سے مغربی رومی سلطنت سے ہوتی ہے، لیکن کئی صدیوں تک اس جغرافیائی اکائی میں برطانیہ بھی شامل نہیں تھا اور سکینڈے نیویا کے ممالک بھی شامل نہیں تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ ترکی اور روس کے مغربی علاقے اور یورپ کے وہ ممالک جو خلافت عثمانیہ کے قبضہ میں تھے، وہ بھی مغرب کی دنیا سے باہر سمجھے جاتے تھے۔ دوسری طرف اب صورت حال یہ ہے کہ جو ممالک مغرب کی جغرافیائی سرحدوں سے ہزاروں میل دور ہیں، مثلاً آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ، وہ بھی مغرب کے تہذیبی تشخص کا حصہ بن چکے ہیں اور آسٹریلیا کے کنزرویٹو وزیراعظم جان ہاووڈ بھی مغربی تہذیب کی بقا کی جنگ لڑنے میں اتنے ہی مستعد ہیں جتنے کہ ٹونی بلیر اور جارج بش۔

اس تجزیے سے یہ بات تو بڑی حد تک واضح ہے کہ ''مغرب'' کی حیثیت تہذیبی اور جغرافیائی اکائیوں کی حد تک کم از کم مشکوک ضرور ہے۔ تو پھر کیا ''مغرب'' ایک مذہبی اکائی ہے؟ تاریخی طور پر اگر مغرب کو صرف یورپ تک محدود سمجھا جائے تو اس کا ایک مذہبی تشخص واضح طور پر نظر آتا ہے، جس کی بنیاد عیسائیت پر تھی اور ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیت نے یورپ کے تشخص اور تہذیبی اقدار میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ایک زمانہ میں یورپ کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کس بہیمانہ طریقے سے ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کو دائرہ عیسائیت سے خارج کر رہے تھے۔ یورپ کی مذہبی وحدت کا نظام مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح کے بعد سے ختم ہو چکا ہے اور اس کا ایک واضح اظہار آج کے دور میں آئرلینڈ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں، یورپ ہی میں مشرقی عیسائیت کے وہ فرقے بھی موجود ہیں مثلاً گریک آرتھوڈکس چرچ، رشین آرتھوڈکس چرچ ـ جو مغربی عیسائیت کی مذہبی روایت کا نہ کبھی حصہ بن سکے اور نہ کبھی سمجھے گئے۔ مغرب کو ایک مذہبی (عیسائی) اکائی سمجھنے اور قرار دینے والے یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ آج کے ۳۴ مغربی ممالک میں سے ۱۴ ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں نے سو سال سے بھی زیادہ حکومت کی ہے۔ تو پھر اسلام کو مغرب کے مذہبی شعور اور مغرب کی مذہبی روایت کا حصہ کیوں نہ سمجھا جائے؟ اس تاریخی حقیقت کے باوجود یورپ کی تاریخ اور اس کی خود تعبیری (Self-perception) سے مسلمانوں کی اس ''یاد'' کو یا تو محو کر دیا جاتا ہے یا اسے صرف کشمکش اور تصادم کا نام دیا جاتا ہے۔ گویا اس پوری تاریخ میں کوئی ثقافتی اور مذہبی تبادلہ ہوا ہی نہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی کے رچرڈ بولیٹ نے اپنی ایک حالیہ تصنیف میں تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے ''اسلامی/عیسائی تہذیب'' کے تصور کو زیادہ قرین قیاس قرار دیا ہے۔

مغرب کو ایک مذہبی (عیسائی) اکائی سمجھنے اور قرار دینے والے یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ آج کے ۳۴ مغربی ممالک میں سے ۱۴ ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں نے سو سال سے بھی زیادہ حکومت کی ہے۔

اسی طرح ہم یہودیت کو کیوں بھول رہے ہیں، جس کے ماننے والے ہزار سال سے بھی زیادہ یورپ میں موجود رہے ہیں! البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی طرح یہودی بھی عیسائی مذہبی تشخص کے لیے ایک فریق دیگر (OTHER) کے طور پر موجود رہے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان دنوں ''یہودی/ عیسائی روایت'' (Judeo-Christian Civilization) یا ''یہودی/ عیسائی تہذیب'' کی اصطلاح، عالم اسلام سے تصادم کے تناظر میں، جس بھائی چارے کے جذبات کے ساتھ مغرب میں استعمال کی جا رہی ہے، وہ جذبات دوسری جنگ عظیم کے بعد، بلکہ بڑی حد تک ۱۹۶۰ء کی دہائی کی پیداوار ہیں۔ آج سے صرف پچاس سال پہلے تک ہمیں مغرب کے کسی بھی معروف دانشور یا سیاست دان کے ہاں یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان بھائی چارے کے جذبات ملتے ہیں اور نہ ہی ان کی مشترکہ تہذیبی اقدار کا ذکر ملتا ہے۔ آج جن یہودیوں کو مغربی تہذیب کا جزو لاینفک بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، انہی یہودیوں کو محض یہودی ہونے کی بنیاد پر، اسی مغرب نے ساٹھ لاکھ کی تعداد میں موت کے گھاٹ بھی اتار دیا تھا۔ خود امریکہ میں آج سے پچاس سال پہلے تک یہ صورت تھی کہ جنوب کی اکثر ریاستوں میں سیاہ فام باشندوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں پر بھی ''گوروں'' کے کلبوں اور ہوٹلوں میں داخلے پر پابندی تھی اور ہاورڈ یونیورسٹی نے اپنے بعض اہم شعبوں میں یہودیوں کے داخلے کے لیے ایک محدود کوٹا مقرر کر رکھا تھا۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغرب نہ تو ایک تہذیبی اکائی ہے، نہ تاریخی حقیقت ہے اور نہ ہی ایک مذہبی اکائی۔ میرے خیال میں مغرب کا تصور ایک سیاسی اور نظریاتی تشکیل (Construction) ہے۔ مغرب کو ایک نظریاتی اور سیاسی اکائی کے طور پر

ایک ٹھوس حقیقت کی حیثیت سے پیش کرنے کا رجحان سرد جنگ کے دنوں میں شروع ہوا جب مغرب کو امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں (بلکہ محض NATO) کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے برعکس ''مشرق'' سے مراد سوویت یونین اور اس کے مشرقی یورپ کے حلیف ممالک تھے۔ یہ محض ایک نظریاتی سیاست کی تقسیم تھی، تہذیبی یا مذہبی اور جغرافیائی تقسیم نہیں تھی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد یوں محسوس

مغرب کے لیے مشرق کی ''روح'' اسلام میں نہیں بلکہ ہندوستانی اور چینی تہذیبوں میں ہے، اس لیے کہ اسلام کے آئینہ میں تو مغرب کو اپنا ہی مانوس چہرہ نظر آتا ہے

ہوتا تھا کہ ''مغرب'' اور ''مشرق'' کی یہ سیاسی اور نظریاتی تقسیم بے معنی ہو جائے گی اور بقول سابق صدر بش سینئر ایک ایسا نیو ورلڈ آرڈر تشکیل پائے گا جو ابھرتی ہوئی عالمگیریت کے اقتصادی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگا۔ لیکن ہوا یہ کہ سرد جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد ''مغرب'' کے (یا یوں سمجھئے کہ امریکہ کے) دائیں بازو کے بعض دانشوروں نے ''تہذیبوں کے تصادم'' کا چرچا شروع کر دیا اور یوں عالمی سیاست میں ایک نئی تقسیم، یعنی تہذیبوں کی تقسیم کی بنا رکھی گئی۔ تہذیبوں کی اس تقسیم میں ان دانشوروں کے نزدیک (جن میں برنارڈ لیوس اور سموئیل ہنٹنگٹن پیش پیش تھے) فوری اور ناگزیر تصادم ''مغربی'' اور ''اسلامی'' تہذیبوں کے درمیان ہونا تھا۔ گویا ''مغرب'' کے لیے سوویت یونین کی جگہ اب ''اسلام'' ایک نئے OTHER کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، جس کے مقابل میں مغرب کے لیے اپنے تہذیبی تشخص کو نمایاں (assert) کرنا ضروری تھا۔ تاہم میرے نزدیک، تہذیبی اصطلاحوں کے محل بے محل استعمال کے باوجود، تہذیبوں کی تقسیم اور تصادم کا نظریہ مذہبی اور تہذیبی اقدار کے اختلافات کا نہیں، سیاسی عوامل اور مفادات کی پیداوار ہے۔

''مغرب'' میں اس وقت دو بڑے کردار ہیں: ایک امریکہ اور دوسرا مغربی یورپ۔ امریکہ کے لیے اسلام کا چیلنج، خارجہ پالیسی اور نیشنل سیکورٹی کے حوالے سے ہے، اس لیے کہ امریکہ کے بین الاقوامی معاشی اور سٹریٹیجک مفادات عالم اسلام سے شدت کے ساتھ وابستہ ہیں اور عالم اسلام میں اسے اپنی بعض پالیسیوں کی وجہ سے شدید سیاسی اور جذباتی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کی دوستی اور تعاون کے باوجود عوامی سطح پر امریکہ کو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی جس مخالفت کا سامنا ہے اس کی وجوہات سیاسی اور اقتصادی عوامل میں تلاش کرنا چاہئیں۔ اس مخالفت کو تہذیبی تصادم کا نام دینا خلط مبحث ہوگا۔

جہاں تک مغربی یورپ کا تعلق ہے تو اس کے لیے ''اسلام'' خارجہ پالیسی کا کم اور داخلی سیاسی تشخص کا مسئلہ زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی یورپ بڑی حد تک نسلی اور تہذیبی سطح پر کثیر الثقافتی (Multi-cultural) تجربہ سے نا آشنا رہا ہے۔ اس تناظر میں لگتا ہے کہ مغربی یورپ پر، گذشتہ ربع صدی میں مسلمان آبادی کے تیزی سے اضافے کے نتیجے میں ایک گہرے نفسیاتی خوف اور بے چینی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے، اور شاید اسی کیفیت کو ''اسلام اور مغرب'' کی کشمکش کا نام دیا جا رہا ہے۔ ایک پہلو سے یہ کوئی عجیب یا انہونی بات نہیں ہے اور یہ ''مغرب'' ہی کے لوگوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ قومیت پرستی کے اس دور میں - اور عالمگیریت کے باوجود - لوگوں کی یہ خواہش کہ وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کے ساتھ رہیں، جو ان کے ہم مذہب و ہم زبان ہوں اور جن کی تاریخی یادیں بھی مشترک ہوں، اور ان کے اردگرد کوئی اجنبی گروہ نہ ہو، قابل فہم ہے۔

''اسلام اور مغرب'' کی اس بحث میں دوسرا عنصر ''اسلام'' ہے اور اسے بھی تشکیل نو (deconstruction) کی ضرورت ہے، کم از کم اس پہلو سے کہ مغرب اور اسلام کی بحث میں بالعموم ''اسلام'' سے کیا مراد لی جاتی ہے؟ باقی مذاہب کی طرح اسلام کا بھی ایک تجریدی اور مابعد التاریخی تصور ہے، جسے اکثر مغربی مفکرین اور اسلامی تحریکوں کے نظریہ ساز ایک جوہر (Essence) اور آئیڈیل کے طور پر پیش کرتے اور سمجھتے ہیں۔ مذہب کی یہ حیثیت اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے، اس لیے کہ اپنی تجریدی صورت میں مذاہب ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتے۔ مذاہب کے درمیان کشمکش ان کے تاریخی اظہار کی شکلوں اور ان کے تحت قائم ہونے والے سیاسی اور معاشرتی قوت کے اداروں میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ''اسلام اور مغرب'' کے درمیان تصادم کی جو باتیں آجکل سننے اور پڑھنے میں آ رہی ہیں، ان کا تعلق مابعد الطبیعاتی مسائل سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں اور اہل مغرب کے سیاسی رویوں، سیاسی پالیسیوں اور سیاسی کردار سے ہے۔

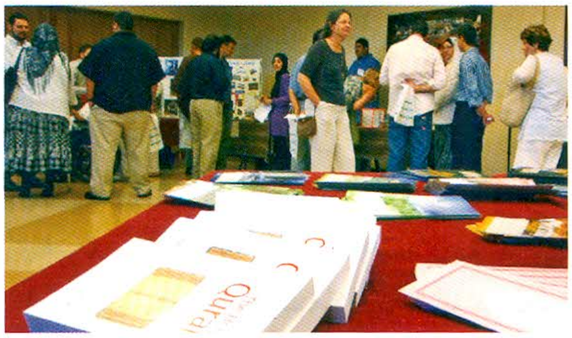

اہل مغرب کے دانشور جب ''اسلام اور مغرب'' کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں تو بالعموم وہ یہ نہیں بتاتے کہ ان کے تجزیے کی اساسی اکائی (unit of analysis) کیا ہے؟ یعنی ''اسلام اور مغرب'' کی ترکیب میں وہ ''اسلام'' سے کیا مراد لیتے ہیں؟ میں نے کئی مغربی مصنفین کو ایک ہی تحریر میں اسلام، اسلامی تحریکوں، مسلمان حکمرانوں، مسلمان معاشروں، مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار، اسلامی مذہبی اور فلسفیانہ فکر اور صدام حسین، کرنل قذافی اور امام خمینی کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرتے دیکھا ہے۔ تو کیا یہ سب اسلام ہیں؟ برنارڈ لیوس ''اسلام اور مغرب'' پر بات کرتے کرتے

ایک ہی سانس میں خلافت راشدہ کی فتوحات، خلافت عثمانیہ، بوسنیا، سید قطب، سعودی نظام تعلیم، ڈنمارک کے کارٹونوں پر کابل اور اسلام آباد میں ہونے والے رد عمل، اور وہابی فکر کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں جیسے ان میں کوئی فرق ہی نہیں اور ان سب علامتوں کو ''اسلام'' کے ہم معنی سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سیموئیل ہنٹنگٹن بھی مغرب کے مقابلے میں اسلام کو اتنا لچک دار اور بے صورت (amorphous) سمجھتے ہیں کہ عالم اسلام کی ''خونیں سرحدیں'' (Bloody Borders) امام خمینی کی فکر، اور ترکی اور انڈونیشیا کی اسلامی جماعتیں اسلام کا مترادف بن جاتی ہیں۔ ایک بار ایک صاحب واشنگٹن کی ایک کانفرنس میں اسلام کے نظریۂ جنگ وامن پر تقریر کر رہے تھے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام صلح جوئی کا نہیں، جنگ وجدل کا مذہب ہے، انہوں نے جو دلائل دیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شام کے (سابق) صدر حافظ الاسد نے ابھی تک اسرائیل کے ساتھ صلح کے معاہدے پر دستخط نہیں کیے۔ یعنی اسلام کے نظریۂ جنگ وامن کا اصل حوالہ حافظ الاسد کا سیاسی رویہ ہے۔ یونیورسٹی آف شکاگو کے مارشل ہاجسن نے اسلام، Islamicate اور Islamdom میں جو تفریق کی تھی، اسے تو کم از کم پیش نظر رہنا چاہئے، یہ نہ ہو کہ جب کسی کا جی چاہے وہ اپنی سہولت کے لیے کسی ایک مسلمان فرد، جماعت، رسم، روایت، معاشرے اور تاریخی دور کو اسلام کا نام دے کر اس کا مقابلہ مغرب سے کرنے لگے۔ اب رہی ''اسلام اور مغرب'' کے درمیان کشمکش اور تصادم کی بات، تو اس سلسلہ میں دونوں جانب آگ لگانے والے لوگ موجود ہیں۔ تاہم فرق یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف سے لے کر ۱۹۹۰ء کی دہائی تک مسلمانوں میں ''مغرب'' کے خلاف تصادم کی نوعیت خالصتاً سیاسی تھی۔ اس میں نہ تو ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کا عنصر غالب تھا اور نہ ہی اس تصادم کو آسمانوں کی جنگ [یعنی مذہبی] سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک قابل فہم نوآبادیاتی نظام کے مملوکات محروسہ کی مزاحمت تھی، کاسمولوجیکل جنگ نہیں تھی۔ گویا ''ناگزیر تصادم'' کے نظریہ کی ابتداء عالم اسلام کے کسی نظریہ ساز سے نہیں، بلکہ اہل مغرب (امریکہ) کے دائیں بازو کے مفکرین، پالیسی ساز اداروں اور ری پبلکن پارٹی کے نیوکنزرویٹوز کی طرف سے ہوئی ہے۔ اسامہ بن لادن اور طالبان سے کئی سال پہلے برنارڈ لیوس نے اپنے مضمون میں ''تہذیبوں کا تصادم'' کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی تھی، جسے بعد میں سیموئیل ہنٹنگٹن نے شہرت دی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک تو صورت یہ تھی کہ وہ اسلامی تحریکیں جنہیں آج مغرب دشمن قرار دیا جا رہا ہے اور جن کی بعض پالیسیوں (زیادہ تر بیانات) کی بنا پر ''تہذیبوں کے تصادم'' کی بات ہو رہی ہے، ''مغرب'' کے دوش بدوش- بلکہ مغرب کے تعاون اور اشتراک کے ساتھ- عالمی اشتراکیت کے خلاف مصروف جہاد تھیں۔ اس سے قبل ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں بھی مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کی بڑی بڑی اسلامی تحریکیں امریکہ کے ساتھ مل کر، عرب نیشنلزم، ناصرازم، عرب سوشلزم، اسلامی سوشلزم اور سوویت کیمونزم کے خلاف جنگ لڑ رہی تھیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں یہی اسلامسٹ ہی تو تھے جو امریکہ ہی کی اشیرباد سے امریکہ ہی کے حلیف کنزرویٹو عرب حکمرانوں سے افغان جہاد کیلئے چندہ جمع کر رہے تھے اور ''مشرق'' اور ''مغرب'' کی سرد جنگ کے ایک نہایت ہی فیصلہ کن اور نازک (critical) لمحے میں مغرب کے حلیف تھے۔ سوال یہ ہے کہ تہذیبوں کے ناگزیر تصادم اور آسمانوں کی جنگ کا نظریہ اس وقت کہاں تھا؟ یہ بات دونوں فریقوں سے پوچھی جانی چاہئے، مغرب کے ان نظریہ سازوں سے جو آج ''اسلام اور مغرب'' کے ناگزیر تصادم کا پرچار کر رہے ہیں، اور ان اسلامی گروہوں اور لیڈروں سے بھی جو ''مغرب'' کی مکمل تباہی تک ''جہاد'' کو جاری رکھنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں کچھ مذہبی دانشور ایسے ہیں، جو عالم اسلام کی ایک تاریک اور مایوس کن تصویر پیش کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو جوش دلایا جائے، اسی طرح کی سوچ اور فکر اہل مغرب کے بعض دانشوروں کے ہاں بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں کے بعض (بلکہ اکثر) مذہبی رہنما یہ کہتے ہیں کہ ہمارے حکمرانوں نے مغربی طاقتوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے ہیں، ہمارے دانشوروں نے مغربی فکر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں، اور ہمارے رہنما معاشرتی، ثقافتی اور علمی مغربی اقدار کو غلاموں جیسی بے بسی کے ساتھ قبول کر چکے ہیں (اور کسی حد تک یہ باتیں درست بھی ہیں)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بالکل اسی طرح کی گفتگو میں نے امریکہ اور یورپ میں بھی سنی ہے۔ پیو فاؤنڈیشن (Peo Foundation) کے ایک فورم میں، میں نے برنارڈ لیوس کو سنا۔ وہ مغرب کے حکمرانوں اور دانشوروں کی بزدلی اور شکست خوردہ ذہنیت کو کوس رہے تھے اور نہایت تأسف کے ساتھ آج کے حالات کا موازنہ ۱۹۳۸-۴۰ء کے دور سے کر رہے تھے جب مغرب ہٹلر کا مقابلہ کرنے اور اس کا راستہ روکنے کی بجائے اسے رجھانے (appease) کی کوشش کر رہا تھا۔ لیوس صاحب کا خیال تھا کہ آج کا مغرب چیمبرلین کی پالیسی پر چل رہا ہے جبکہ ضرورت اس وقت چرچل کی ہے۔ (اس پس منظر میں) کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ عالم اسلام اور مغرب کے ان دونوں طبقات کا مقصد ایک ہے۔ یعنی خطرے کا ایک ہوا کھڑا کر کے اپنے اپنے لوگوں کو ایک بڑی تہذیبی جنگ کے لیے تیار کرنا اور افہام وتفہیم اور سیاسی جدوجہد کی بجائے جنگ جوئی کے راستے پر لگانا؟

یہ احساس ہوتا ہے کہ دونوں طرف کے کچھ لوگ (اور امریکہ میں ایسے لوگوں کی آوازیں نائن الیون کے بعد زیادہ زورشور سے سنائی دے رہی ہیں) سیاسی تنازعات کی جنگ نظریاتی بنیادوں پر لڑنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں اس وقت

''اسلام اور مغرب'' کے مسئلہ کو ''دہشت گردی'' کے محور کے گرد گھمایا جا رہا ہے۔ ''دہشت گردی'' کے خلاف امریکہ نے جو حکمت عملی اختیار کی ہے، اس کے تین پہلو ہیں: ایک تو ہے "Bang Bang" جس کا مظہر ان دنوں عراق اور افغانستان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسری Law Enforcement جس کا اظہار Patriot Act اور گوانتانا موبے میں ہو رہا ہے اور تیسری حکمت عملی وہ ہے جسے ''نظریاتی جنگ'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ ''اسلام اور مغرب'' کا مسئلہ دراصل اس تیسری حکمت عملی کا حصہ ہے۔ امریکہ کے دائیں بازو کے نظریہ ساز اور پالیسی ساز ایک نظریاتی جنگ برپا کرنا چاہتے ہیں اور یہ نظریاتی جنگ دو مختلف سطحوں پر لڑنے (یا لڑانے) کی باتیں ہو رہی ہیں: ایک سطح پر تو یہ جنگ ''اسلام اور مغرب'' کے درمیان ہے اور دوسری سطح پر خود اسلامی دنیا میں داخلی تہذیبی جنگ ہے، جو ان لوگوں کے نزدیک پہلی جنگ سے بھی زیادہ اہم ہے، یہ جنگ ہے ''اعتدال پسند'' اور ''شدت پسند'' مسلمانوں کے درمیان، یعنی ''اچھے'' اور ''برے'' مسلمانوں کے درمیان۔ تاہم ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ داخلی جنگ صرف اسلامی تہذیبی دنیا میں ہی برپا ہوتی نظر آتی ہے، اس کا کوئی مظہر، یا اس کی کوئی ضرورت ''مغرب'' میں دکھائی نہیں دیتی۔ وہاں تو گویا انتہا پسند موجود ہی نہیں ہیں، وہاں تو سب اعتدال پسند ہیں۔ یوں پوری اسلامی دنیا کو دو طبقات میں تقسیم کرنا اور وہ بھی مغرب کے بارے میں رویے کے حوالے سے، اوریئنٹلزم (استشراق) کی ایک نئی شکل ہے۔ بالفاظ دیگر اسلامی دنیا کی اپنی پہچان کے لیے بھی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہے؟ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ عراق میں امریکی قابض فوج کے خلاف جو لوگ مزاحمت کر رہے ہیں (مزاحمت کے طریقہ کار سے ہم کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کریں) کیا وہ ''اسلام اور مغرب'' کی جنگ لڑ رہے ہیں؟ کیا اس مزاحمت کے لیے کوئی کم وزنی، سیاسی دلیل نہیں ہے؟ اگر آپ اسے ''دہشت گردی'' سے بھی موسوم کرنا چاہیں تو مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں ہوگا، لیکن صدر بش اور ٹونی بلیر کی اس بات سے یقیناً مجھے اختلاف ہوگا کہ عراق میں وہ اسلاموفاشسٹ (Islamo-fascists) کے خلاف مغربی تہذیب کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

اسی طرح ''اچھے'' اور ''برے'' مسلمانوں کی تقسیم بھی عجیب ہے۔ ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب کے بعد سلفی، وہابی اور سنی ''اچھے'' مسلمان تھے اور شیعہ ''برے'' مسلمان۔ اب صورت حال خاصی پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے: لبنان میں سنی اچھے مسلمان ہیں لیکن عراق کے سنی برے مسلمان ہیں۔ عراقی شیعہ اچھے مسلمان ہیں مگر لبنانی شیعہ برے لوگ ہیں۔ تو پھر کیا اچھے اور برے مسلمانوں کی یہ تقسیم ایک Rhetorical device نہیں ہے؟ ژژک نے گذشتہ دنوں ایک مضمون میں لکھا تھا کہ اسلام نہ صرف ''مغرب'' بلکہ خود ''مشرق'' کے لیے بھی ایک پیچیدہ تہذیبی مسئلہ ہے: مغرب والوں کے لیے وہ مشرق بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور مشرقی روحانیت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور مشرق والوں کے سامنے وہ اپنی مغربیت کا رعب جھاڑنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ دونوں کے لیے بیک وقت اچھا بننے کی کوشش میں دونوں کے لیے غیر بن جاتا ہے۔

تاہم مشرق و مغرب کی اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مغرب کے لیے مشرق کی ''روح'' اسلام میں نہیں بلکہ ہندوستانی اور چینی تہذیبوں میں ہے، اس لیے کہ اسلام کے آئینہ میں تو مغرب کو اپنا ہی مانوس چہرہ نظر آتا ہے، مشرق کی پرکشش و پراسرار فضا (mystique) نظر نہیں آتی۔ اسی طرح مشرق کی دلہن سے مغرب کے دولہا کے ازدواجی تعلقات میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہے، جسے اپنی مردانگی کا اتنا ہی بڑا

اسلامک سنٹر آف کینیڈا

دعویٰ ہے جتنا کہ مغرب کو۔ ولفرڈ کینٹ ویل سمتھ صاحب سے میری واحد ملاقات ان کی وفات سے کچھ ماہ پہلے شکاگو کی ایک کانفرنس میں ہوئی۔ چائے کے وقفے میں، میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ دوران گفتگو امریکہ اور عالم اسلام کے تعلقات کا ذکر آیا تو پروفیسر سمتھ صاحب نے کہا:

"One thing common between the US and Islam is that both do not want to be messed around."

(امریکا اور اسلام میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں فضول اور مکدر کرنے والے رویے کو پسند نہیں کرتے)

گویا اس بحث کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ''اسلام اور مغرب'' کے درمیان اچھے تعلقات کی بنیاد اس بات پر رکھی جا سکتی ہے کہ امریکہ اور عالم اسلام کے ایک دوسرے سے mess-around نہ کریں۔ مغربی یورپ کے ممالک اپنی اپنی مسلمان آبادیوں کو عزت اور وقار کے ساتھ اپنے ہاں رہنے کے مواقع فراہم کریں اور مغربی ملکوں میں رہنے والے مسلمان اپنے اسلامی تشخص کو میزبان معاشروں کے مدمقابل لا کھڑا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یو ایس آئی ایس (USIS) کی ایک ٹیلی کانفرنس میں چند سال پہلے اسی ''اسلام اور مغرب'' پر گفتگو کے دوران پروفیسر ونسٹ کارنیل نے، جو سفید فام، اینگلوسیکسن نسل کے مسلمان ہیں اور جن کے باپ دادا دو سو سال سے بھی زائد عرصہ سے امریکہ میں آباد تھے، ایک موقع پر بہت جھنجھلاہٹ اور غصہ سے کہا: میری طرف دیکھئے! کیا میں ''مغرب'' نہیں ہوں اور کیا میں ''اسلام'' نہیں ہوں۔